پوری کائنات ہے۔ اور سوچنا چاہیے کہ کیا یہ حادثات ہمارے کسی قصور کی وجہ سے کسی بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ تو نہیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم اپنے مالک کے حضور میں توبہ کریں، اپنے اخلاق کو بہتر بنائیں اور اُس عہد و پیمان کو یاد رکھیں جو ہم نے بحیثیت قوم اس ملک کی آزادی کے وقت اپنے خالق سے باندھا تھا، جسے ہم آہستہ آہستہ بھولتے چلے جا رہے ہیں۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ

جس طرح ہوا کے رُخ کا محض تنکوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح کسی فرد، معاشرے یا حکومت کے عزائم اور ارادوں کو جانچنے کے لیے بسا اوقات روزمرہ کے واقعات بڑی مدد دیتے ہیں۔ بلکہ واقعات جتنے غیر اہم ہوں اُسی نسبت سے وہ نیتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ انسان فطری طور پر اپنی نیت کو دوسروں سے مستور رکھنا چاہتا ہے اور اس لیے وہ اسے جان بوجھ کر کبھی بے نقاب نہیں ہونے دیتا۔ لیکن دوسری طرف نیت، جو ہمارے قلب و دماغ کے ہر ریشے میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے، اپنے اظہار کے لیے بیتاب رہتی ہے اور جس وقت بھی وہ انسان کے شعور کو غافل پاتی ہے، فی الفور لاشعور کے راستے سے غیر ارادی افعال و اعمال اور غیر شعوری الفاظ کے اندر چھپ کر باہر آجاتی ہے اور انسان کے بالمقابل کھڑے ہو کر بالکل اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ہے: یہ ہے تمہاری اصل حقیقت!

نیت کا یہ باغیانہ کردار ظاہرداریوں کے سارے رنگین پردوں کے تار بکھیر کر رکھ دیتا ہے اور اس تضاد کا راز فاش کر دیتا ہے جو انسان کے ظاہری اعمال اور داخلی عزائم کے درمیان پایا جاتا ہے۔ نیت کے اس طرزِ عمل سے نہ صرف افراد بے نقاب ہوتے ہیں بلکہ کسی تہذیب کی باطنی کیفیات کا کھوج لگانے میں بھی اس سے مدد ملتی ہے اور ہم پر یہ حقیقت آشکارا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جاتی ہے کہ افراد کی طرح بہت سی تہذیبیں بھی جو اپنی ظاہری چمک دمک میں ہمیں بڑی دلفریب دکھائی دیتی ہیں، باطن میں بڑی تاریک ہیں۔

دوسری تہذیبوں کو فی الحال نظر انداز کیجیے اور صرف مغربی تہذیب کے متضاد پہلوؤں کا جائزہ لیجیے تو آپ پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ آپ یہ دیکھیے کہ اس تہذیب میں انسان کی معاشی ترقی اور اس کی معاشرتی فلاح و بہبود پر کتنا زور صرف کیا جا رہا ہے، لیکن اس کی اخلاقی زندگی سے جس پر اس کی فلاح کا، بلکہ اس کی حیات کا دارومدار ہے، مجرمانہ تغافل برتا جاتا ہے۔ ایک طرف تو آسمانوں پر کمندیں ڈالنے کے عزائم ہیں مگر دوسری طرف انسانیت کو برباد کرنے کے لیے جوہری بم اور اسی نوعیت کے مختلف تباہ کن سامان تیار کیے جا رہے ہیں۔ اس تہذیب کے اسی تضاد کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ سطحیت، اوچھا پن، لاف زنی اور فریب اس کے لازمی اجزا ہیں۔

اس تہذیب نے جن ممالک میں بھی قدم جماتے ہیں وہاں انسانیت کے حقیقی جوہر کو شدید نقصان پہنچا ہے اور انسانوں کی زیادہ تر صلاحیتیں ایسے کاموں میں ضائع ہوتی ہیں جو انسانیت کے لیے کسی لحاظ سے بھی مفید اور کارآمد نہیں۔

دور نہ جائیے، ذرا پاکستان کے حالات پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں حکام عالی مقام اور ان کے چند دانشتگان کے لیے ملک کے وسائل کس بے دردی سے صرف ہو رہے ہیں اور عوام کی حقیقی ضروریات پر کتنی توجہ دی جاتی ہے۔

کسی ملک میں انسان کی ایک بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اس کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ مگر یہاں اس معاملے میں جو تغافل برتا جا رہا ہے وہ انتہائی افسوسناک ہے۔ قتل و غارت، ڈکیتی، اغوا ہماری زندگی کے معمولات بن گئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں اور انہیں روکنے کے لیے کوئی موثر تدبیر نہیں سوچی جاتی۔ انسانی قتل سے کہیں زیادہ انسانیت سوز اور بہیمانہ جرم معصوم بچوں کا اغوا ہے۔ ہوسکتا ہے پولیس اور فوج کی حفاظت میں رہنے والے حضرات کو اس جرم کی سنگینی اور اس کے خوفناک نتائج کا احساس نہ ہو لیکن جن گھرانوں پر یہ افتاد پڑتی ہے ان کے مصائب کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ بچہ اگر مرجائے تو والدین اور متعلقین کو کچھ مدت گزرنے کے بعد صبر آجاتا ہے لیکن بچے کا اغوا ایک ایسی چوٹ ہے جس کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے۔ بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی محرومی ہے جس کی یاد انسان کو قبر تک ستاتی ہے اور ہر گھڑی احساسِ غم میں شدت پیدا کرتی ہے۔ ایسے بدنصیب انسان جیتے نہیں بلکہ محض سانس لیتے ہیں اور ان کا ہر سانس نالہ و فریاد ہوتا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے جہلم کے سیشن جج نے اس گھناؤنے جرم کے ایک مرتکب کو پھانسی کی سزا کا حکم سناتے ہوئے اس انسانیت سوز فعل کا جن الفاظ میں ذکر کیا ہے وہ قابلِ غور ہیں:

"بچے کا اغوا ایک ایسا جرم ہے جس کی سنگینی قتل سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ اس سے بچے اور اس کے والدین کو تاحینِ حیات شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

(پاکستان ٹائمز ۱۱ر جون ۶۵ء)

فاضل جج کے یہ الفاظ بالکل صحیح اور درست ہیں۔ ایک شخص کو جب قتل کیا جاتا ہے تو اسے ایک مرتبہ ہی انتہائی تکلیف اور درد کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جو بدنصیب بچہ اغوا کیا جاتا ہے جب تک زندہ رہتا ہے اس وقت تک اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اُن کی ہڈیوں کو توڑ کر اور اُن کے جسموں کو داغ کر انہیں ایسی قابلِ رحم حالت میں بازار میں لایا جاتا ہے کہ لوگوں کے دل انہیں دیکھتے ہی پسیج جائیں اور وہ اُن پر رحم کھا کر زیادہ سے زیادہ خیرات دیں۔ اخبارات میں اکثر ایسی خبریں بھی شائع ہوئی ہیں کہ یہ معصوم بچے ظالموں کے دردناک عذاب کو برداشت نہ کرسکے اور انہوں نے دم توڑ دیا۔ پھر بچیوں کو جس قسم کی ہولناک ہوس کاریوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے اُس کے تصور سے ہی جسم پر لرزہ طاری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جاتا ہے۔ یہ جرائم ایسے نہیں جو اکا دکا نگاہوں کے سامنے آئیں۔ یہ ہماری زندگی کے معمولات بن چکے ہیں۔ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے، آپ کو اُس کے ایک صفحہ پر ہی اس قسم کے متعدد رُوح فرسا واقعات کا تذکرہ ملے گا۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ حکومت جسے اپنی استعدادِ کار، اپنی قابلیت اور قوم کے ساتھ غیر معمولی محبت پر بڑا ناز ہے، وہ آخر اس سنگین جُرم کے قلع قمع کے لیے کیوں مُوثر قدم نہیں اٹھاتی۔ ہم اُسے اتنا بے بس نہیں پاتے جس حکومت کی پولیس سیاسی کارکنوں کی معمولی سے معمولی حرکت پر کڑی نگاہ رکھتی ہے اور اُن کی ہر نقل و حرکت سے ہمیشہ باخبر رہتی ہے .. اُس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اِن سماج دشمن عناصر کی سرگرمیوں سے غافل ہو گی۔ جو حکومت اپنی کرسیوں کی حفاظت کے لیے اتنی چوکس رہتی ہے اور اس کے لیے پوری قوت صرف کرتی ہے، اُسے لوگوں کے دُکھ درد اور انسانی جان کے احترام کا واقعی احساس ہو تو اُس کے لیے موثر تدابیر اختیار کر کے ننھی مُنّی کلیوں کا تحفظ مشکل نہیں ہے۔ مگر اس معاملے میں جس افسوسناک بے پروائی کا ثبوت دیا جا رہا ہے اس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ حکومت کی نظر میں اس ظلم کی وہ اہمیت نہیں ہے جو درحقیقت ہونی چاہیے۔ جو حکومت سمندر کی تہ میں سے سونا برآمد کر سکتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان ظالموں کا کھوج لگانے میں ناکام ہو جائے جو انسانیت کے غارت گر ہیں۔

حکومت کا یہ طرزِ عمل بھی اُس خاص طرزِ فکر کا نتیجہ ہے جو مغربی تہذیب نے پیدا کر رکھا ہے۔ اس طرزِ فکر کے مطابق کسی معاشرے میں بنیادی اہمیت انسان کے بجائے سرمائے کو حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ہماری سوسائٹی کی توجہ کے مرکز اور معاشرے سے ہر قسم کی مراعات اور خدمات کے مستحق وہ لوگ ہیں جو صاحبِ سیم و زر ہیں۔ جو اقتدار کے تخت پر متمکن ہیں، جن کے ہاتھوں میں ملک کی زمامِ کار ہے۔ رہے وہ لوگ جو ثروت کی آنکھ سے مستور جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اُن کے دُکھ درد، اُن کے مصائب اور ان کی پریشانیوں سے حکومت کو کوئی سروکار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں۔ اُن کے ساتھ سماج دشمن عناصر جو ظلم و زیادتی بھی کریں اُسے عام معمول سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور انتظامیہ اُن کے بچوں کے اغوا کے تدارک کے لیے اتنی سرگرمی بھی نہیں دکھاتی جتنی کہ اصحابِ اختیار کے کتوں اور دیگر جانوروں کی حفاظت میں دکھاتی ہے۔

ہم اس ملک کے اربابِ بست و کشاد سے یہ مؤدبانہ التماس کرتے ہیں کہ وہ براہِ کرم اپنے بچوں سے اپنی محبت کا جائزہ لیں اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ اگر خدانخواستہ وہ کبھی اس ہولناک مصیبت میں گرفتار ہو جائیں تو اُن پر کیا بیتے گی۔ اولاد خواہ امیر والدین کی ہو یا غریب والدین کی، اپنے ماں باپ کے لیے وہ دل کے ٹکڑے ہی ہوتے ہیں۔ اُن پر جب کبھی اس قسم کی وحشتناک افتاد پڑتی ہے تو انہیں زندہ درگور بنا دیتی ہے۔ یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں جس کے بارے میں کوئی اختلاف ہو۔ یہ خالص انسانیت کا مسئلہ ہے۔ انسانی ہمدردی کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اس کی طرف پوری توجہ صرف کرنی چاہیے اور اس کے اس پہلو کو نظر انداز کر دینا چاہیے کہ اس میں کتنی محنت صرف ہو گی۔ اگر اس ظلم کا تدارک کر لیا گیا تو دنیا میں جتنی نیک نامی حاصل ہو گی، اور دکھی دلوں سے اہلِ اقتدار اور انتظامیہ کے حق میں جو دعائیں نکلیں گی، ان کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے ملک کے سربراہوں کو اجرِ عظیم عطا کرے گا۔ ان حضرات کی یہ کارگزاری اس حقیقت کی شہادت دے گی کہ انہیں انسانیت سے وابستگی ہے اور وہ انسانی مسائل کو شہرت و ناموری کی خاطر نہیں بلکہ اخلاص اور ہمدردی سے حل کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔

یورپ اس وقت جس اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کے دلوں سے احساسِ زیاں بھی آہستہ آہستہ رخصت ہو رہا ہے اور اُن کی بدکرداریوں کو قانون کی پشت پناہی حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ وہاں انحطاط کا انداز یہ رہا ہے کہ پہلے کسی اخلاقی برائی نے جنم لیا اور اس نے معاشرے کے رگ و پے میں سرایت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا شروع کر دیا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر جب عوام ذرا مضطرب ہوئے تو وہاں کے اہلِ دانش اس بُرائی کے خلاف آواز بلند کرنے اور لوگوں کو اس سے متنفر کرنے کے بجائے اُس کی تائید و حمایت پر کمر بستہ ہو گئے اور اُسے فطرت کے عین مطابق ثابت کرنے کے لیے باطل دلائل کا ایک انبار لگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں اُس کے متعلق جو خلش موجود تھی وہ ختم ہو گئی اور اس کے بعد قانون کے ذریعہ اُسے جائز بنا دیا گیا۔

صحبتِ ہم جنس (عملِ قومِ لوطؑ) کا مرض جس تشویشناک سرعت کے ساتھ امریکہ اور یورپ میں بڑھ رہا ہے وہ انسانیت کے لیے ایک خطرناک چیلنج کا حکم رکھتا ہے اور اس نے تہذیب کی بنیادوں تک کو ہلا دیا ہے لیکن داد دیجیے مغربی حکماء اور اہلِ خرد اور اہلِ بصیرت کی کہ انہوں نے اس کے تدارک کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانے کے بجائے اسے عقل اور قانون دونوں کی سند عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس رفتار سے لوگ اس قبیح اور خلافِ فطرت فعل کے عادی ہوتے اسی جذبے اور ولولے کے ساتھ مغربی مفکرین اسے فطری فعل ثابت کرنے میں اپنی قوتیں کھپانے لگے۔ انہوں نے کہا چونکہ اس فعل کا انسان صدیوں سے ارتکاب کرتا چلا آ رہا ہے اس لیے یہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو جرم انسانیت کے اندر مدتِ دراز سے موجود ہو وہ جرم نہیں رہتا بلکہ عین نیکی بن جاتا ہے۔ ان حضرات نے اس جرم کے معاشرتی اور تہذیبی اثرات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہنا شروع کیا کہ جو شخص اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار ہے اس لیے وہ سزا کا مستوجب نہیں بلکہ طبیب اور ڈاکٹر کی ہمدردی کا مستحق ہے۔ ان اہلِ دانش کے افکار میں نہایت واضح منطقی مغالطہ اور بڑا کھلا تضاد ہے۔ انگلستان میں جو کمیٹی اس جرم کے معاشرتی اور قانونی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے قائم ہوئی تھی اُس کے ایک معزز رکن آدیر نے بڑے واضح الفاظ میں ان کے اس غلط طرزِ فکر کی نشاندہی کی ہے۔ اُس نے کہا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اگر ایک فرد کے معاملے میں آپ اتنی ہمدردی کی تلقین کر رہے ہیں تو آپ کو پورے معاشرے کی فلاح و بہبود کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ یہ فعل پوری معاشرتی زندگی کے لیے ایک زبردست خطرہ ہے اور اس کا قوم کے اجتماعی اخلاق پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ ممکن ہے ہر مجرم ذہنی اعتبار سے مریض ہی ہو لیکن اگر ہر مجرم کو اسی بنا پر کھلی چھوٹ دے دی جاتے تو اس سے پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔"[1]

اس کمیٹی نے قانون میں تغیر کے لیے جو سفارشات پیش کیں ان پر ہر طرف سے بڑی لے دے ہوئی۔ لیکن اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں اور اس کے حامیوں نے کسی معقول سے معقول بات کی طرف بھی توجہ نہ دی اور قوم کے اجتماعی ضمیر کو اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ یہ بالکل ایک فطری فعل ہے کیونکہ انسان کے اندر اس کی خواہش پائی جاتی ہے۔ اس لیے معاشرے کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔

البتہ انہوں نے ایک "عنایت" یہ ضرور کی کہ اس فعل کے جواز پر کچھ شرائط عائد کر دیں۔ ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا ارتکاب کھلے بندوں نہ کیا جائے۔ اور دوسری یہ کہ دونوں فریق بالغ ہوں اور وہ آپس میں رضامند ہوں تاکہ اجتماعی مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ شرائط انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ جرم بہرحال جرم ہی ہے خواہ اسے عوام الناس کے سامنے کیا جائے یا اسے لوگوں کی نظروں سے چھپ کر کیا جاتے۔ اور اس کے اثرات ہر دو صورتوں میں فرد اور معاشرے پر پوری طرح مرتب ہوتے ہیں۔

جرم درحقیقت انسانی ضمیر سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔ جس ماحول میں بھی یہ کیا جائے انسان کی انسانیت کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے اور اس کا مرتکب آہستہ آہستہ ان ساری حدود

---

[1] PEPORT OF THE COMMITTE ON HOMOSEXUAL OFFENCES & PROSTITUION. P. 116

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو توڑتا چلا جاتا ہے جو انسان اس پر عائد کرتا ہے۔

جس اخلاق کا سرچشمہ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت نہ ہو اس میں کبھی بھی استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی حشر اس صحبتِ ہم جنس جیسے گھناؤنے جرم کا بھی ہوا۔ "پرائیویٹ" کی شرط پر بڑی جرح ہوئی اور اس کے صحیح حدود متعین نہ کیے جا سکے۔ بعض نے کہا یہ شرط بڑی احمقانہ ہے۔ جب اس فعل کو ایک فطری فعل تسلیم کر لیا جاتا ہے تو پھر اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا شخصی آزادی میں بیجا مداخلت ہے جس کی کسی حکومت کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ پھر بالغ کی شرط کا بھی خوب مذاق اڑایا گیا اور یہ کہا گیا کہ جب ایک فرد اس فعل کے لیے رضامند ہے اور اس کے نتائج کو برداشت کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ پاتا ہے تو حکومت کو اس کے معاملے میں دخیل ہونے کا کوئی حق نہیں۔

خالص منطقی نقطۂ نظر سے ان دلائل میں کوئی سقم معلوم نہیں ہوتا۔ اگر آپ انسانی زندگی کو پرائیویٹ اور پبلک حصوں میں تقسیم کر کے کسی شخص کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی شخصی زندگی میں جو چاہے کرے تو پھر آپ اس سے کسی مقام پر بھی باز پرس نہیں کر سکتے۔ شخصی اور اجتماعی زندگی کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ ان کے درمیان کوئی خطِ امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔ ایک شخص اپنی انفرادی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ لازمی طور پر پوری اجتماعی زندگی کو متاثر کرتا ہے، اور اسی طرح وہ اپنی حیاتِ اجتماعی میں جس طرزِ عمل کو اختیار کرتا ہے اس کی شخصی زندگی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس قسم کے غلط اور بے بنیاد فلسفوں نے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے ان کے اندر مزید پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا کیا ہے۔ جس گندگی کو بھی کسی فرد کی انفرادی اور شخصی زندگی میں گوارا کیا گیا اس نے بالآخر پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سوسائٹی نے اس کے خلاف نبرد آزما ہونے کی بجائے پہلے اسے ایک حقیقی ضرورت ثابت کیا اور پھر اسے بسر و چشم قبول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر لیا ۔ ابھی چند روز ہوئے انگلستان کی پارلیمنٹ میں صحبتِ ہم جنس کو قانونی جواز دینے پر جو بحث ہوئی وہ اس غلط طرزِ فکر کی ہر لحاظ سے آئینہ دار ہے ۔ ایوان کے ایک رکن آران نے اس قبیح فعل کو قانونی طور پر جائز قرار دینے کے لیے جو تقریر کی اس کے مندرجہ ذیل اقتباسات قابلِ غور ہیں:

"بعض اعداد و شمار کے مطابق انگلستان میں دس لاکھ افراد یعنی ہر ۲۵ میں سے ایک شخص اس گناہ میں ملوّث ہے ۔ اگر یہ لوگ اپنے آپ کو اس سے باز رکھیں تو یہ اُن کے لیے ایک ناروا پابندی ہے ۔ اور اگر وہ اس کا ارتکاب کریں تو وہ تعزیر کی زد میں آتے ہیں ۔ انسان کی بنیادی خواہشات یا اُس کی نفسیات کو بدلا نہیں جا سکتا ۔ اگر وہ فطری طور پر صحبتِ ہم جنس کی طرف مائل ہے تو وہ اس کا ارتکاب کرتا رہے گا ۔ ایسے حالات میں اس کو سزا دینا کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں ۔ یہ اقلیت پر ظلم و ستم ہے ۔ اُسی نوعیت کا ظلم و ستم جو یہودیوں اور حبشیوں پر ڈھایا گیا ۔" (پاکستان ٹائمز ۔ مئی ۱۹۶۵ء)

اس کارروائی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ملک کے سب سے بڑے مذہبی رہنما اور سیرت و اخلاق کے سب سے بڑے علمبردار یعنی چرچ کے سب سے اونچے نمائندے آرچ بشپ آف کنٹربری ، جن سے اس طرزِ فکر کی شدید مخالفت کی توقع تھی ، انہوں نے بھی اس کی حمایت میں تقریر کی اور اسے قانونی جواز عطا کرنے کا فتویٰ دیا ۔ اُن کے مندرجہ ذیل الفاظ کتنے عبرت انگیز ہیں اور انسانیت اور اخلاق کے مستقبل کے بارے میں کتنا تاریک تصور پیش کرتے ہیں ۔ انہوں نے کہا :

"میری دانست میں بالغوں کے درمیان صحبتِ ہم جنس اگر رضامندی سے ہو تو یہ قرینِ عقل و انصاف ہے اور اس بنا پر میں قانون کے اندر مناسب تبدیلیوں کے حق میں ہوں ۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی ماہ کے آغاز میں راولپنڈی میں گورنروں کی جو کانفرنس منعقد ہوئی اس میں رشوت ستانی کے متعلق بھی غور وخوض کیا گیا اور اس کے تدارک کے لیے ایک اعلیٰ اختیارات کی کمیٹی کے قیام کی سفارش کی گئی جو سرکاری افسروں کے کام کی نگرانی کرتی رہے۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ اربابِ اختیار کو اس امر کا احساس تو ہوا ہے اور اس کی روک تھام کے لیے انہوں نے چند تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ لیکن ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی نگاہیں بُرائی کے اُس سرچشمے کی طرف نہیں گئیں جس سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ رشوت ستانی، اقربا نوازی، خیانت، قتل وغارت، اغوا، ڈاکہ، بدمعاملگی یا اسی طرح کی دوسری بُرائیاں سب ایک ہی چشمہ سے پھوٹتی ہیں اور وہ چشمہ ہے خدا سے غفلت جب تک انسان کے اندر یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی علیم وبصیر ذات ہماری دلی کیفیات اور ہمارے پوشیدہ اور ظاہری سارے اعمال کو دیکھ رہی ہے اس وقت تک ہمارے اندر دیانت اور امانت کا صحیح شعور بیدار نہیں ہوسکتا دل کی انجان گہرائیوں میں اُبھرنے والے معصیت آلود خیالات اسی چشمِ ہمہ بین کے احساس سے دب سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کسی قوم کا اجتماعی مزاج اور عدالت کے تادیبی قوانین ایک حد تک انسانی اعمال کو خاص حدود کا پابند بناتے ہیں۔ لیکن صرف ان کی جکڑ بندیاں انسان کو خیر پر قائم رکھنے کے لیے ناکافی ہیں۔ ان قوانین سے زیادہ DAY LIGHT MORALITY "اجالے کا اخلاق" پیدا ہوسکتا ہے جو اپنے اندر کے اعتبار سے سلبی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر فطری طور پر گناہ اور جرم سے بچنے کی امنگ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ماخوذ ہونے کے اندیشے، اور قانونی شکنجے اور احتساب کے خوف سے وہ بُرائی سے باز رہتا ہے ظاہر بات ہے کہ اخلاق کی جو عمارت اس قسم کی کمزور بنیادوں پر استوار ہوگی وہ کبھی مضبوط نہیں ہوسکتی۔ حقیقی اور پائیدار اخلاق صرف ایمان باللہ ہی سے جنم لیتا ہے، یعنی ایک سمیع وبصیر، علیم وخبیر ہستی پر ایمان لانے سے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کے حضور میں بالآخر انسان کو پیش ہو کر اپنے ہر چھوٹے اور بڑے عمل کا حساب دینا ہے۔

© rasailojaraid.com